مغربی نظامِ وکالت کی اصلاح

چند اہم تجاویز

مولانا بشیر احمد قاضی محکمہ عدلیہ آزاد کشمیر

کافی دنوں سے وکالت کے پیشہ سے متعلق خبریں اخبارات کی زینت بنی رہی ہیں۔ وکلاء کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ ان کے پیشہ کو ختم کیا جا رہا ہے۔ لاہور کے وکلاء نے اس خدشہ کا اظہار بھی کیا۔ حکومت کی طرف سے ان کو یہ کہا جاتا رہا کہ یہ تہمات غلط ہیں۔ صورتِ حال خواہ کچھ بھی ہو ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ وکالت کے پیشہ کی ضرورت کیا ہے؟

نظری حیثیت سے وکیل کا کام یہ ہے کہ وہ عدالت کو قانون سمجھنے اور مقدمہ زیرِ بحث کے حالات پر اسے منطبق کرنے میں مدد دے۔ اصولاً یہ ضرورت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ایک مقدمہ میں دو ماہرین قانون کی رائیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کی رائے میں ایک فریق کا مقدمہ مضبوط ہو تو دوسرے کی رائے میں دوسرے فریق کا اور عدالت کے لیے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے دونوں طرف کے دلائل سے مطلع ہونا یقیناً مفید ہوتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی جو صورت پیشۂ وکالت کی شکل میں اختیار کی گئی ہے۔ کیا فی الواقع اس سے یہ دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں؟ ایک وکیل اپنی قانونی مہارت کو لے کر دفتر میں بیٹھ جاتا ہے اور تیار رہتا ہے کہ جس مقدمہ کا جو فریق بھی اس کو بھاری فیس ادا کرنے کے لیے تیار ہو اس کے حق میں وہ قانونی نکات سوچنا شروع کر دے۔ اس کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ میرا مؤکل حق پر ہے یا باطل پر۔ مجرم ہے یا بے گناہ۔ اپنا حق لینا چاہتا ہے یا دوسرے کا حق مار کھانا چاہتا ہے۔ اس کو اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ قانون کا منشاء درحقیقت کیا ہے اور اس کی رو سے اس کے مؤکل کا مقدمہ صحیح ہے یا غلط۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس نے مجھے فیس دی ہے اور میرا کام اس کی حمایت کرنا ہے۔ اس لیے وہ مقدمہ کو چھیل بنا کر قانون کے مطابق ڈھالتا ہے۔

کمزور پہلوؤں کو چھپاتا ہے اور موافق پہلوؤں کو ابھارتا ہے۔ گواہوں کے بیانات سے وہ چیزیں چھانٹی کرتا ہے جو اس کے مؤکل کے حق میں ہوں۔ اس طرح وہ اپنی فنی مہارت کی وجہ سے عدالت کو بھی اپنی پسند کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کو اس سے کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ حق دار محروم ہو جائے اور محروم شخص حق دار بن جائے۔ اس کے سامنے قانون کے منشا کی تکمیل کے بجائے اپنے مؤکل کی پسند کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک وہی حق پر ہے جو اس کو فیس ادا کر دے۔ اب آپ غور فرمائیں کہ کیا فی الواقع ہمارا دین و مذہب اس کی اجازت دیتا ہے؟ کیا فی الواقع ایسے ماہرین قانون کا مشورہ عدالت کو انصاف کے کام میں کچھ مدد دے سکتا ہے جو علانیہ اس مقصد کے لیے فیس لے بیٹھے ہوں کہ قانون کی تعبیر لازماً اپنے مؤکل کے حق میں کریں گے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک ہی نوعیت کے مقدمہ میں ایک وکیل اپنے مخالف وکیل کے دلائل کی خوب تردید کرتا ہے لیکن اگر اسی نوعیت کے دوسرے مقدمہ میں وہی وکیل مخالف وکیل کی جگہ کھڑا ہو جائے تو وہی دلائل دینے شروع کر دیتا ہے جن کی پہلے مقدمہ میں خود تردید کر چکا ہوتا ہے۔ وہ مسلسل دلائل کے انبار لگائے جاتا ہے خواہ ذاتی رائے اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

اب اگر کہا جائے کہ اسلام اس طرزِ عمل کی اجازت نہیں دیتا تو اس میں وکلاء کے لیے ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جو شخص کسی کی ناحق امداد ایک کلمہ سے بھی کرے تو قیامت کے دن اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا "آئِسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللہ" یعنی یہ شخص اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے والا ہے"۔

درحقیقت موجودہ نظام وکالت سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے جس میں اصل مقصد روپیہ جمع کرنا ہوتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز؟ اس طرح اس نظام وکالت نے ہمارے نظامِ عدل و انصاف کو سخت دھچکا لگایا ہے اور صرف اتنا ہی نہیں کیا ہے کہ ہماری سوسائٹی میں قانون کی پیروی کے بجائے اس کی خلاف ورزی کو وسعت دی اور طاقت بخشی ہو۔ بلکہ اس کا نقصان ہماری پوری اجتماعی زندگی میں پھیل گیا ہے اور ہماری سیاست بھی اس کی وجہ سے گندی ہو کر رہ گئی ہے پچھلی دس بارہ صدیوں میں آدھی سے زیادہ دنیا پر مسلمانوں نے حکومت کی ہے اور کہیں ان کے نظام عدالت میں اس طرح کے قانونی پیشے کا ہمیں نشان نہیں ملتا۔ البتہ شورائیت کا قانون رائج تھا۔ اگر عدالت کو کسی مسئلہ میں تعاون کی ضرورت پڑتی تو ماہرین قانون سے مشورہ کر سکتی تھی۔ وہ ماہرینِ قانون

© rasailojaraid.com

چونکہ کسی فریق مقدمہ کے وکیل نہیں ہوتے تھے اس لیے ان کا مشورہ صحیح انصاف تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہوتا تھا۔ مگر اس وقت ہمارے ملک میں وکالت کا پیشہ جو رُخ اختیار کر گیا ہے اس سے جلد اور سستا انصاف مہیا ہونا انتہائی مشکل ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ انصاف لینے کے لیے عمر نوح اور خزانہ قارون چاہیئے۔ وکیل جب جرح کرنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو قانونی نکات کی وضاحت پر کم توجہ ہوتی ہے۔ زیادہ تر توجہ اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ طویل ترین جرح کر کے اپنے مؤکل کو خوش کر لے اور اپنے آپ کو عوام کی نگاہ میں ایک قابل ترین وکیل ظاہر کر کے ان کی توجہات کا محور بن جائے۔ اس وقت اس کو اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کی طویل جرح سے دوسرے لوگ جو باہر اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں ان کی انتظار کی گھڑیاں لمبی ہو رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے صبح سے شام تک دوسرے مقدمہ کا گواہ مایوس ہو کر واپس چلا جاتا ہے اور آئندہ عدالت کی طرف رُخ کرنے سے گریز کرتا ہے پھر ممکن ہے کہ وہ چھ ماہ تک بھی دوبارہ عدالت کو دستیاب نہ ہو۔ اس طرح مقدمہ زیر سماعت کی عمر اور لمبی ہو جاتی ہے۔ اگر وہی گواہ کہیں بیرون ملک چلا گیا یا مر گیا تو مقدمہ کا حشر جو ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اس مصروف ترین زندگی میں اتنا وقت کسی کے پاس نہیں ہوتا کہ وہ بار بار عدالتوں کا چکر کاٹتا پھرے اور صبح سے لے کر شام تک احاطۂ عدالت میں کھڑے اپنی باری کے انتظار میں خون خشک کرتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ عدالت کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ نامعقول جرح سے وکیل کو روک دے مگر عملاً ہوتا یہ ہے کہ جب عدالت اس طرح کسی وکیل کو روکے تو آگے وہ اپنی بات کو معقول ظاہر کرنے کے لیے دلائل شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح سے بھی وقت خرچ ہو جاتا ہے اور پرنالہ اپنی جگہ پر ہی ہوتا ہے بلکہ ایسی صورت میں اگر عدالت کے احترام میں اس وقت خاموشی بھی ہو جائے تو اس کے پاس مقدمہ کی تاخیر کے جو دوسرے دروازے ہوتے ہیں ان سے کام لے لیتا ہے۔

مثلاً یہ کہ وہ عدالت کے رویئے کو جانب داری پر محمول کر کے مقدمہ کو منتقل کرانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ پھر مقدمہ کے انتقال میں ایک مخصوص طریقہ کار ہے جس کو پورا کرنے میں ممکن ہے دو ماہ کا مزید وقت لگ جائے۔ مزید برآں یہ کہ ایک وکیل کو ابتدائی درجہ کی عدالت سے لے کر ملک کی سب سے آخری عدالت تک مقدمات میں پیش ہونے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس لیے وکیل اس قانون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر عدالت کے مقدمات کو لے لیتا ہے اس سے گر اس کو کافی

فائدہ پہنچ جاتا ہے مگر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جب وہ کسی ایک عدالت میں پیش ہوتا ہے تو اس کے مقدمات جو دوسری عدالتوں میں ہوتے ہیں ان میں اس کی عدم حاضری کی وجہ سے ایک طرف عدالت کو انتظار کرنا پڑتا ہے اور دوسری طرف مقدمہ کے فریقین اور گواہان کو انتظار رہتا ہے۔ بعض اوقات اس کی اس روش کی وجہ سے اگلے تاریخ بغیر اس دن کی مطلوبہ کارروائی کے، پڑ جاتی ہے اور مقدمہ اور لمبا ہو جاتا ہے۔ اس طرزِ عمل سے واضح ہے کہ جلد انصاف ملنے کا خواب کیسے شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔

اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وکیل کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیئے اس لیے کہ وہ کبھی کسی جلسہ میں ہوتا ہے اور کبھی کسی میں۔ اس کو قید و بند کی صعوبتوں سے بھی گذرنا پڑتا ہے اس طرح سے اس کے متعلقہ مقدمات پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ فریقین جو اس کو فیس ادا کر چکے ہوتے ہیں وہ اتنی سکت نہیں رکھتے کہ اب وہ نئے وکیل کو فیس ادا کر کے مقدمہ کی پیروی کے لیے کھڑا کریں۔ انجام کار فیس ادا کرنے والا فریق وکیل کے رحم و کرم پر ہی ہو جاتا ہے۔ ان حضرات کی یہ دلیل واقعی معقول اور قابلِ توجہ ہے اگر کسی وکیل کو سیاست کا شوق ہو تو اس کو حق ہے کہ یہ شوق پورا کرے مگر اس میں اس کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ اس شوق کی تکمیل میں بندوں کے حقوق جو اس نے اپنے ذمے لے لیے ہیں وہ اس شوق کی نظر نہ ہو جائیں۔ فیس لینے کے بعد اس کا اپنے موکل کے ساتھ مقدمہ کی پیروی کرنے کا ایک عہد معاہدہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ دوسری مصروفیات میں رہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس عہد کے ایفاء میں ناکام رہتا ہے اور ایسا تو کبھی سننے میں نہیں آیا کہ دیگر مصروفیات کی وجہ سے اگر وہ مقدمہ کی پیروی نہ کر سکا ہو تو اس نے موکل کو فیس واپس کر دی ہو۔ خصوصاً فوجداری مقدمات میں جو لوگ وکیل کے ذریعہ ہر تاریخ پر اصالتاً حاضری سے مستثنیٰ ہوتے ہیں ان کی جگہ وکیل کی حاضری ہر تاریخ پر لازمی ہوتی ہے ورنہ ان کی مستثنائی منسوخ کی جا کر ان کی طلبی ضروری ہو جاتی ہے اور ان کے ضامنان کی ضمانت بھی ضبط کی جاتی ہے مگر ایسی صورت میں مستثنیٰ شدہ افراد کو یہ علم نہیں ہوتا کہ ان کا وکیل حاضر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کار روزگار میں اندرون ملک یا بیرون ملک جا چکے ہوتے ہیں۔ پھر ان کے خلاف عدالت ۵۱۲ ض ف کی کارروائی عمل میں لاتی ہے۔ اس سے مقدمہ طویل سے طویل ترین بن جاتا ہے۔ اگر وکلاء اپنے ہم پیشہ عظیم سیاست دانوں یعنی قائدِ اعظم، لیاقت علی خان، اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے نقشِ قدم پر چلیں تو اس طرح کی خامیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے جب سیاست میں حصہ لینا شروع کیا

© rasailojaraid.com

تو پہلے انہوں نے مقدمات کی پیروی کرنی ترک کر دی تھی۔ درحقیقت دونوں کام سرانجام دینے بیک وقت عملاً ممکن بھی نہیں۔

ہمارے اس تجزیے سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ وکالت کے موجودہ نظام کو جوں کا توں اگر باقی رکھا جائے تو جلد انصاف کا خواب کبھی بھی پورا نہ ہوگا۔ اسی طرح اس نظام کے تحت انصاف سستا بھی ممکن نہیں۔ اس لیے کہ آٹے دال اور چینی وغیرہ اشیاء کی طرح وکیل کی فیس کسی پرائس کنٹرول کے تحت نہیں ہوتی۔ ہر وکیل کی فیس کا بھاڑا اپنا ہوتا ہے۔ جو وکیل زیادہ ذہین اور محنتی ہوگا وہ بجائے اس کے کہ اپنی اس خداداد صلاحیت کو صحیح انصاف کے احیاء پر مرکوز رکھے اور اس قابلیت کا شکر ادا کرے وہ اپنی فیس کو بہت بھاری رکھتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کی صلاحیت کا فائدہ سرمایہ دار کو تو پہنچ سکتا ہے لیکن غریب مظلوم اپنی غربت کی سزا کاٹتے ہوئے ظالم سرمایہ دار کے بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ جرائم پیشہ اور تخریب کار دوگوں کے پاس سرمایہ کی کوئی کمی نہیں ہوتی وہ جرم کے ارتکاب سے قبل ہی اس کا بندوبست کر لیتے ہیں بلکہ اپنے ذہن میں وکیل کے بارے میں بھی سوچ لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد فوراً نذرانہ لے کر اس کے دفتر میں پہنچ جاتے ہیں اور آگے اس کا ذہن و دماغ ان کو بے گناہ ثابت کرنے کے طریقے تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس میں اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا کہ جو فیس اس کو ادا کی گئی ہو وہ درحقیقت مقتول کی جیب سے ہی قاتل نے لائی ہو۔ مقتول کے ورثاء کو مالی اعتبار سے اوّل تو پولیس ہی نیم جان کر دیتی ہے اور رہی سہی کسر وکیل نکال لیتا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر غریب اور بے کس لوگ ظلم پر صبر کر لیتے ہیں لیکن مقدمہ دائر کرنے سے گریز کر جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس نظام کے تحت سستے اور جلد انصاف کی توقع رکھنا ؎

این خیال است و محال است و جنوں

آج ہماری عدالتیں مقدمات سے بوجھل ہو چکی ہیں۔ عدالتوں کی الماریوں میں مسلوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ جگہ ہی نہیں۔ ہر سال الماریوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ——————

—————— اس میں شک نہیں۔ کہ مقدمات کی تاخیر میں دیگر عوامل بھی ممکن ہیں مگر اس میں مرکزی کردار ہمارے موجودہ مغربی نظامِ وکالت کا ہے۔ جب یہ نظام نہیں تھا تو مقدمہ بازی بھی ناپید تھی۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حضرت عمرؓ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے

زمانے میں ایک مرتبہ کوفہ کے چیف جج حضرت سلمانؓ بن ربیعہ باہلی اپنی عدالت میں مسلسل چالیس دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے، صرف اس لیے کہ ان کے پاس سرے سے کوئی مقدمہ آیا ہی نہیں (الاستیعاب)۔

اس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں جبکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ مدینہ کے قاضی تھے، پورا ایک سال گذر گیا کہ ایک مقدمہ بھی ان کے سامنے پیش نہ ہوا۔ اس وقت اگر مقدمہ بازی سکھانے والا کوئی ہوتا تو ان کو بھی یہی مشکل پیش آسکتی تھی۔

ہمارے مغربی نظامِ وکالت نے سرمایہ دار طبقہ کی حوصلہ افزائی کی ہے اور جرائم کو ختم کرنے کے بجائے ان کی آبیاری کی ہے۔ تاخیری حربوں کے بے شمار طریقے اختراع کر کے مقدمات کا ڈھیر لگانے میں مدد دی ہے۔ اگر اس نظام کی اصلاح نہ کی گئی تو مظلوم اس نظام کی بھٹی میں مزید ظلم کا شکار ہوگا اور ظالم اپنے جور و استبداد کے پنجے اور مضبوط کرے گا۔ اس مرحلہ پر اس نظام کی اصلاح کی مندرجہ ذیل تجویز پیش کی جاتی ہے۔

یعنی یہ کہ نظامِ وکالت کو نظامِ شورائیت سے تبدیل کیا جائے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عدالت کو انصاف تک پہنچنے کے لیے ماہرینِ قانون کی امداد کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا ہر عدالت کے ساتھ ایسے افراد کو بطور مشیر مقرر کیا جائے۔ اس سے نظامِ وکالت کے قیام کا جو مقصد تھا بطریق احسن پورا ہو جاتا ہے۔ عہدِ رسالتؐ، عہدِ صحابہؓ اور اس کے بعد کئی صدیوں تک شورائیت کا نظام دیگر شعبوں کی طرح خود عدالت کے معمول میں بھی رہا ہے۔ ایک دو مثالیں اس وقت بھی پیش کی جاتی ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے زمانے میں کوفہ کے حاکمِ اعلےٰ تھے اور سلمان بن ربیعہ قاضی تھے۔ ایک شخص نے ان دونوں کے پاس اپنا مقدمہ پیش کیا کہ ایک شخص کا انتقال ہوگیا ہے اس نے ایک بیٹی، ایک پوتی اور ایک بہن چھوڑی ہے اس کا ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے۔ ان کی اپنی رائے یہ تھی کہ نصف ترکہ بیٹی کا حق ہے، اور نصف پوتی کا اور ہمشیرہ محروم ہے۔ مگر انہوں نے اس مسئلہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی مشورہ کیا تو انہوں نے حدیث پیش کرتے ہوئے ان کی رائے کے خلاف فتویٰ دیا۔ انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی رو سے نصف بیٹی کو، چھٹا حصہ پوتی کو اور ہمشیرہ کو باقیماندہ دیا جائے۔ چنانچہ اس فتویٰ کے بعد انہوں نے اپنی رائے اسی کے مطابق تبدیل کر دی حضرت

© rasailojaraid.com

عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ایک مرتبہ ایک عورت پر حد کی سزا عائد کی۔ جب حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا یہ حاملہ ہے۔ یہ سُنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ چونک اُٹھے اور حکم کو وضعِ حمل تک ملتوی کر دیا اور حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا "لولا علیٌّ لھلک عمر" یعنی اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں چیف جسٹس "ابن ابی لیلیٰ" تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک عورت پر حد کی سزا عائد کی تو امام ابوحنیفہؒ سے جب دریافت کیا گیا تو آپ نے اس فیصلہ میں چھ غلطیاں نکالیں۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہے کہ "قضاۃ" اپنے فیصلوں کے بارے میں مشورہ بھی کرتے رہے ہیں، البتہ وہ دور چونکہ خیر و صلاح کا دور تھا، حکومت کو باضابطہ طور پر مشیر مقرر کرنے کی ضرورت نہ تھی اس لیے کوئی باضابطہ ادارہ وجود میں نہ آیا تھا۔ مگر اب رفتارِ زمانہ کی وجہ سے انتظامی ضرورت اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ ہر عدالت کے ساتھ قانون کے ماہرین کی تقرری بطور مشیر قانون عمل میں لائی جائے اور عدالت گواہان پر خود جرح بھی کرے۔ اگر کوئی ضروری بات عدالت کے پوچھنے سے چوک جائے تو مشیروں کو بھی توجہ دینے کا حق ہونا چاہیئے۔ اس طرزِ عمل کا ایک طرف وکلاء کے چنگل سے گواہان اور فریقین کو آزادی مل جائے گی۔ دوسری طرف یہ بھی فائدہ ہوگا کہ گواہ خوشی سے عدالت میں آنے کی کوشش کرے گا۔ اس وقت تو صورتِ حال کچھ اس طرح ہے کہ سچا گواہ عدالت سے گریز کرتا ہے۔ وکلاء کی تیز و تند جرح سے اس کے اوسان اپنی جگہ پر قائم رہنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی واقعہ رونما ہو جائے لوگ وہاں سے بھاگنے لگ جاتے ہیں اس ڈر سے کہ کل کون وکلاء کا تختۂ مشق بنا رہے گا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرزِ عمل سے جھوٹے اور پیشہ ور گواہان کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اسلام نے ایک طرف اگر گواہ کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ سچی گواہی کو چھپائے نہیں اور عدالت کی طلبی پر حاضر ہو جائے تو دوسری طرف زبانِ رسالت سے یہ بھی اعلان کیا گیا کہ "اکرموا الشھود" یعنی گواہان کے ساتھ عزت و احترام کا معاملہ کیا جائے لیکن جب موجودہ نظام کے تحت گواہ عدالت میں آتا ہے تو وکیل کو یہ توقع ہوتی ہے کہ اگر وہ زبان کھولے تو اس کے مطلب کے لیے کھولے۔ اگر اس کے مطلب کے مطابق جواب نہ آئے تو وہ جھنجھلا کر اس کو درغلیدہ قرار دینے کی درخواست کرتا ہے یا ہیر پھیر کر کے مشکل سوالات میں گواہ کو پھنسا دیتا ہے۔ ایک دیہاتی گواہ وکیل کی مہارت کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر عدالت خود جرح کرے تو نہ صرف سچے گواہوں کی حوصلہ افزائی

ہو گی بلکہ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ عدالت کی جرح چونکہ غیر جانب دار ہو گی۔ اس لیے عدالت کی جرح سے مقدمہ کے بہت سے خفیہ پہلو سامنے آجائیں گے جو وکلاء کی جرح سے ممکن ہے ابھی تک پردہ اخفاء میں ہی رہیں اس لیے کہ ہر وکیل اپنے مطلب کی جرح کرے گا اس سے ممکن ہے ایسے پہلو رہ جائیں جن کا تعلق نفسِ واقعہ کی وضاحت سے ہو۔

ہماری اس تجویز سے موجودہ نظام وکالت سے جو مقصد تھا وہ اس تجویز سے انتہائی بہتر انداز سے پورا ہو جاتا ہے اور اس نظام کی خرابیوں سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظام شورائیت کے قیام کے بعد کیا اس مغربی نظام وکالت کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ انصاف کے حصول کے لیے اس نظام کی ضرورت بالکل نہیں رہتی۔ البتہ ایک دوسری دلیل اس نظام کے باقی رکھنے کے سلسلہ میں دی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ متاثر ہوں گے ان کی روزی کا مسئلہ کس طرح حل ہو گا؟ یہ سوال واقعی خاصا پریشان کن ہے مگر اس کا کچھ حل تو اس طرح نکل آتا ہے کہ بعض وکلاء کو عدالت کا مشیر مقرر کیا جائے اور ان کو باقاعدہ تنخواہ دی جائے دیگر حضرات کو حکومت دوسرے شعبوں میں ملازمت کے مواقع مہیا کرے۔ ایک دوسری دلیل اس نظام کو باقی رکھنے کے لیے یہ بھی دی جا سکتی ہے کہ عوام کے لیے مقدمہ کو قابل رفتار بنانے کے لیے رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس نظام وکالت کو ان کی رہنمائی کے لیے باقی رکھنا ضروری ہے بلاشبہ ان کی رہنمائی کا اصول بھی مسلّم ہے۔ مگر ان کے مقدمات کو آج کل بھی عدالتوں کے ساتھ جو اپیل نویس حضرات ہوتے ہیں وہ ان کے مقدمات کو قانونی صورت میں تحریر کر دیتے ہیں۔ یہ ضرورت تو ان سے بھی پوری ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی کمی محسوس ہو تو اپیل نویسی شعبہ کو ہی زیادہ مؤثر بنایا جا سکتا ہے۔ البتہ ان کو عدالت کے اندر مقدمہ کی پیروی کی اجازت نہ دی جائے۔

اگر حکومت ہماری اس تجویز کو تسلیم کر لے تو انصاف جلد اور سستا مہیا ہو گا۔ اس کے باوجود اگر کوئی خامی رہے تو اس کی اصلاح بھی کی جا سکتی ہے لیکن اگر حکومت انصاف کے راستہ میں اس سنگ گراں کو ہٹانے کے حق میں نہ ہو تو پھر کم از کم ہماری متبادل مندرجہ ذیل تجاویز کو عملی شکل دے۔

۱۔ مقدمات کی درجہ بندی کی جائے اور ہر مقدمہ کی فیس کا تعین کیا جائے قتل جیسے سنگین مقدمہ کی فیس ایک ہزار روپیہ سے زائد نہ ہو۔ یہی صورت دیگر سنگین نوعیت کے مقدمات میں بھی ملحوظ رکھی جائے۔

© rasailojaraid.com

۲۔ وکلاء کی درجہ بندی کی جائے جو وکلاء اعلیٰ عدالتوں میں پیش ہوں ان کو ماتحت عدالتوں کے مقدمات میں پیش ہونے کی اجازت نہ دی جائے تاکہ فریقین اور ماتحت عدالتوں کو انتظار نہ کرنا پڑے۔ البتہ اگر کوئی خاص مجبوری ہو تو اسی کی حد تک الگ سے عارضی اجازت لے کر پیش ہوں۔

۳۔ جو وکلاء سیاست میں حصہ لینا چاہیں اس کی ان کو اجازت حاصل ہو مگر اس کے بعد ان کو وکالت کا کاروبار کرنے سے روک دیا جائے۔

۴۔ وکلاء کو دفاتر حکومت مہیا کرے اور ان سے معمولی کرایہ وصول کرے۔

۵۔ وکیل کی ماہانہ آمدن کا اندازہ اسی قدر ملحوظ رکھا جائے جتنی اس جج کی تنخواہ ہو جس کے سامنے وکیل پیش ہونا ہو۔ البتہ اگر جج کو تنخواہ کے علاوہ دیگر مراعات حاصل ہوں تو اسی قدر اس کو زائد فیس کی اجازت ہو۔ وکیل کے کوائف کو جج کے ساتھ ہم آہنگ کرنے اس لیے بھی ضروری ہیں کہ موجودہ مغربی نظام وکالت میں بھی وکیل کی حیثیت کا تعین "پارٹ آف دی کورٹ" (Part of the court) کے الفاظ سے کیا گیا ہے یعنی "وکیل عدالت کا بازو ہوتا ہے"۔ اور ظاہر ہے کہ بازو کا ایک جیسا موٹا ہونا ہی بدن کی صحت کا باعث ہوتا ہے۔

۶۔ ضمانتوں کے سلسلہ میں وکیل کو پیش ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس لیے کہ ان میں کوئی پیچیدہ بات نہیں ہوتی کہ فریقین کو کوئی پریشانی ہو۔ اس لیے فریقین از خود پیش ہوں۔

۷۔ وکیل جس مقدمہ میں ایک دفعہ فیس وصول کرلے اس مقدمہ میں اگر اس کو اپیل کورٹ میں پیش ہونے کا حق ہو تو قانوناً اس کو دوبارہ فیس لینے کا حق حاصل نہ ہو بلکہ پہلی فیس پر ہی مقدمہ کی پیروی کرے۔ البتہ اگر اس کا موکل دوسرا وکیل مقرر کرنا چاہے تو یہ اور بات ہے۔

درحقیقت وکالت کا پیشہ کوئی تجارت کی منڈی نہیں ہے جہاں انصاف بکتا ہو بلکہ یہ پیشہ ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا ہے۔ اس پیشے کو اختیار کرنے والا اس عزم کے ساتھ آئے کہ وہ زخمی دلوں پر نمک نہیں چھڑکے گا بلکہ ان کی مرہم پٹی کی خدمت کو اپنے لیے متاع حیات بنائے گا۔

om